محمد جعفر پھلواروی

کمرشل انٹرسٹ کی دینی حیثیت

مارچ ۱۹۵۸ء کے "ثقافت" میں جناب سید یعقوب شاہ صاحب (سابق چیف آڈیٹر پاکستان) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جو دراصل ایک سوال پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ "کمرشل انٹرسٹ" کے بارے میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے؟ شاہ صاحب موصوف نے اس بارے میں بہت سے علماء سے سوال کیا ہے۔ بہت سی کتابیں اور بہت سے مضامین پڑھے ہیں۔ لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ کمرشل انٹرسٹ کے بارے میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے؟ قرآن میں ربا (سود) کی مطلق ممانعت آئی ہے۔ جس وقت حرمتِ ربا کے احکام نازل ہوئے اس وقت کمرشل انٹرسٹ کے وجود کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے یہ چیز زیر بحث آگئی کہ کمرشل انٹرسٹ کو کس پر قیاس کرنا چاہئے؟ جائز تجارت پر یا ناجائز ربا پر؟

کمرشل انٹرسٹ کے ترجمہ کا اثر ہم نے جان بوجھ کر عنوان میں "کمرشل انٹرسٹ" کا لفظ رکھا ہے کیونکہ پہلے اس کے معانی کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "تجارتی سود" کیا جاتا ہے اور لفظ "سود" ــــ جو "ربا" کا بھی ترجمہ ہے ــــ آجانے کے بعد ایک عامی مسلمان فی الفور اس کو ربا سمجھ کر حرام قرار دے دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا ترجمہ "تجارتی منافعہ" بھی کیا جا سکتا ہے۔

کسی حرام شے کو حلال یا حلال کو حرام قرار دینے کے لئے محض لفظ کو دیکھنا کافی نہیں۔ اگر کمرشل انٹرسٹ کو "ربح" (تجارتی نفع) میں شمار کیا جائے تو اسے تجارتی منافعہ کہا جانا زیادہ موزوں ہوگا اور اگر ربا ثابت ہو تو اس کا ترجمہ سود ہونا چاہئے۔ اسے طے کئے بغیر ہمیں نہ تجارتی نفع کہنے کا حق ہے نہ کاروباری سود قرار دینے کا۔ اس لئے ہم اپنے مضمون میں کمرشل انٹرسٹ ہی کا لفظ استعمال کریں گے۔ اگر یہ فی الواقع ربا ہے تو اسے ربح کہہ کر جائز نہیں کیا جا سکتا اور اگر ربح ہے تو اس کا ترجمہ تجارتی سود کرنا درست نہ ہوگا۔ جن لوگوں کے نزدیک سارے دریائی جانور حلال ہوں ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گھوڑا تمہارے نزدیک بھی حرام ہے لہٰذا پانی کے گھوڑے کو بھی حرام سمجھو۔ جس طرح صرف لفظ "گھوڑا" حلت و حرمت کا فیصلہ نہیں کر سکتا اسی طرح لفظ "سود" ترجمے میں جانے سے کمرشل انٹرسٹ کو حرام قرار دینا درست نہ ہوگا تاآنکہ ربا کا پوری طرح اس پر اطلاق نہ ہو۔

انٹرسٹ کا کیا مطلب ہے؟ ربا کا ترجمہ عام طور پر انٹرسٹ INTEREST کیا جاتا ہے۔ انٹرسٹ کے معنی بیاج اور سود کے بھی ہیں اور نفع PROFIT کے بھی۔ لیکن جس ربا کا ذکر قرآن میں آیا

ہے اس کا ترجمہ INTEREST کی بجائے USURY زیادہ صحیح ہے۔ USURY کے معنی آکسفورڈ ڈکشنری میں یہ لکھے ہیں:

The practice of charging excessive or illegal rates of interest for money on loan, Exorbitant interest for money

یعنی قرض کی رقم پر حد سے زیادہ یا غیر قانونی منافعے کی شرح وصول کرنا۔

الفرائد الدریہ میں بھی ربا کا ترجمہ یہ کیا ہے:

Usury, Unlawful profit

یعنی ربا کے معنی میں USURY اور غیر قانونی نفع۔ گویا انٹرسٹ Interest کے جہاں بہت سے معانی ہیں وہاں کے اس معنی فائدہ (advantage) نفع (Profit) مفاد (Benifit) بھلائی (Good) حصہ (share) دباؤ (influence over others) ۔ بھی ہیں۔

چونکہ ربا بھی بظاہر فائدہ اور نفع ہی دکھائی دیتا ہے اس لئے اسے بھی انٹرسٹ کہا جانے لگا۔ حالانکہ انٹرسٹ ایسے نفع کو بھی کہتے ہیں جو بالکل جائز ہو محض نفع اور دباؤ کی رعایت سے اس لفظ کے معنی یہ بھی ہو گئے:

Money paid for the use of money lent or for forbearance of a debt according to a fixed ratio (Rate per cent)

یعنی وہ رقم جو رقم قرض کے عوض یا قرض کی تاخیر ادائیگی کی برداشت کے معاوضے میں معین شرح (فی صد) کے مطابق ادا کی جائے۔

اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ربا دراصل USURY ہے اور INTEREST کا صحیح ترجمہ سود ہے جو جائز اور ناجائز دونوں ہو سکتے ہیں۔ جب ہم "بے سود" اور "سود مند" کے الفاظ بولتے ہیں تو اس وقت "ربا" کا کوئی مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ لیکن جب "سود خواری" کا لفظ ادا کرتے ہیں تو اس سے مراد "رباخواری" ہوتی ہے۔ بالکل یہی شکل "انٹرسٹ" کی ہے۔ اس کا ترجمہ سود کرنا تو غلط نہیں لیکن چونکہ عام طور پر یہاں سود سے مراد ربا ہی لی جاتی ہے اس لئے "ربح" اور "منافع" کا کوئی مفہوم ذہن میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمرشل انٹرسٹ کا ترجمہ تجارتی سود کی بجائے تجارتی منافعہ یا ربح کرنا زیادہ درست ہے۔ کیونکہ ہماری فکرِ خام اسی نتیجے پر پہنچی ہے کہ کمرشل انٹرسٹ ربا نہیں بلکہ ربح ہے اور اگر اس کے جواز کی کوئی دلیل کتاب وسنت میں نہیں ملتی تو عدم جواز کی دلیل بھی نہیں ملتی۔

اب رہا حضرت عمر کا یہ فرمانا کہ دعوا الربا والریبہ (ربا کو بھی چھوڑو اور اس چیز کو بھی جس میں اس کا شائبہ پیدا ہو) تو بلاشبہ یہ اعلیٰ مراتب تقویٰ ہیں اور ہمارا نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ معاشرے کو ایسے مقام پر پہنچایا

جائے جہاں یہ شبہ و شک والی بات بھی ختم ہو جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سر دست اس عبوری دور میں کیا کیا جائے اور کون سا طریقہ ہو جو معاشی کاروبار میں رکاوٹ نہ پیدا ہو؟ حضرت عمرؓ کے فرمان کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس کی لپیٹ میں صرف کمرشل انٹرسٹ ہی نہ آئے گا بلکہ بے شمار چیزیں آئیں گی جن کا ذکر ہم اس وقت مناسب نہیں سمجھتے۔ بوقت ضرورت ہم ان حضرات سے دریافت کریں گے جو اپنا سارا زور کمرشل انٹرسٹ ہی پر دیتے ہیں اور زندگی کے بیشمار گوشوں میں صرف "ربیہ" کو نہیں بلکہ "اربی الربا" کو بخوشی گوارا کئے ہوئے ہیں۔ مفتی کا کام محض یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ صرف فتوے دے کر الگ ہو جائے بلکہ مشکل کا حل اور غلط کا صحیح بدل بھی بتانا چاہیئے۔ یہی ہے کتاب اللہ اور حکمت کا تقاضا۔

کمرشل انٹرسٹ کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کمرشل انٹرسٹ کیا چیز ہے اور اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے اور اس کا ثمرہ کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ تجارت کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو تجارتی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن سرمایہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تجارت نہیں کر سکتے۔ ان کو تجارتی مقاصد کے لئے بہر حال سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے یہ مطلوبہ سرمایہ اسے قرض لینا پڑتا ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں جو محض فی سبیل اللہ کسی کو غیر معین مدت کے لئے قرض دے دے۔ ہر انسان اپنا سرمایہ اسی جگہ لگاتا ہے جہاں اسے کچھ نفع کی توقع ہو۔ اس نفع کی دو شکلیں ہیں:

۱۔ منافعے میں اپنا حصہ رسدی لگالے۔ مثلاً یہ طے کرے کہ جو منافعہ ہوگا اس میں نصف یا تہائی وغیرہ ہمارا ہوگا۔ یعنی سرمایہ ہمارا اور محنت تمہاری۔ نفع میں دونوں شریک۔ اسے فقہ میں مضاربت کہتے ہیں اور یہ فقہ اسلامی میں جائز ہے۔

آگے چلنے سے پہلے یہاں دو ضروری باتیں پیش نظر رکھئے۔ ایک یہ کہ اس صورت میں سرمائے دار کوئی محنت نہیں کرتا، صرف سرمایہ لگاتا ہے اس توقع پر کہ جسے سرمایہ دیا جا رہا ہے اس کی دیانت، محنت اور حکمت دینے والے کی نظروں میں قابل اعتماد ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ نفع نہ ہو یا اتنا نقصان ہو کہ راس المال کا کوئی حصہ بھی واپس نہ ملے۔

۲۔ دوسری شکل نفع کی یہ ہوتی ہے کہ ہم تمہیں اتنا روپیہ دیتے ہیں لیکن نفع میں کوئی حصہ رسدی نہیں رکھتے بلکہ ایک مختصر سی معین رقم مقررہ میعاد پر لیا کریں گے۔ مثلاً ایک یا دو فی صد۔ یہی کمرشل انٹرسٹ ہے۔

ربا اور ربح کی مخلوط شکل

اس صورت نفع میں بھی چند باتیں پیش نظر رکھئے:

الف۔ دینے والا فرض کیجئے اگر دو ہزار روپیہ قرض دیتا ہے اور اس کے عوض ایک معین رقم مثلاً چالیس روپے ماہانہ (راس المال کے علاوہ) وصول کرتا ہے تو اس معین رقم کی شکل بالکل ربا کی سی نظر آتی ہے۔ اسی لئے یہ مسئلہ زیر بحث آگیا ہے۔

ب۔ قرض لینے والا یہ چالیس روپے ماہانہ اپنی جیب سے نہیں دیتا بلکہ وہ اس رقم قرض کو تجارت میں لگا کر مثلاً سو روپیہ ماہانہ کما لیتا ہے اور اسی نفع میں سے چالیس روپے دیتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے اس کا چالیس فی صد منافع میں شریک ہونا بالکل مضاربت کی سی شکل ہوتی ہے۔ تجارتی اغراض کیلئے بنک اسی قسم کا قرض دیتے ہیں۔ نیز جو لوگ بینک میں اپنی رقم جمع کرا دیتے ہیں ان کی اس رقم سے بینک بھی تجارت ہی کرتا ہے اور اسی کے منافع میں سے ایک معین رقم ادا کرتا ہے۔

ج۔ اس قرض میں بہ ظاہر تو قرض دینے والا صرف منافع میں شریک معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل معاملہ یوں ہوتا ہے کہ قرض لینے والا اپنے تجربے اور عقل سے ایک اندازہ لگاتا ہے اور وہ بڑی حد تک درست ہی ہوتا ہے کہ اس رقم کو تجارت میں لگانے کے بعد نفع و نقصان کو ملا کر بھی اتنی بچت ہو گی جس میں اگر ہم قرض دینے والے کو امتادے دیں جب بھی ہمیں اتنا بچے گا۔ وہ اس رقم کو ایک مدّتِ معینہ تک اُلٹ پھیر کرنے کی اسکیم بناتا ہے۔ اس میں وہ اپنے نقصان کا بھی پرسنٹیج نکال لیتا ہے اور فی صد نفع کا بھی اندازہ کر لیتا ہے اس کے بعد وہ یہ طے کر لیتا ہے کہ اگر ہم کم از کم اتنا ماہانہ منافعہ دے دیا کریں گے تو ہمارا کوئی نقصان نہ ہو گا بلکہ پھر بھی ہمیں نفع ہی حاصل کرینگے۔ مثلاً نفع نقصان نکال کر ہم دس فی صد منافعہ کما کر اس میں سے تین یا چار فیصد قرض دینے والے کو ادا کر دیا کریں گے۔

یہ صورت حال ایسی ہے کہ اگرچہ بہ ظاہر قرض دینے والے کو صرف منافعہ حاصل ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اس نقصان میں بھی شریک ہوتا ہے جو قرض لینے والا کاروباری شخص دورانِ تجارت میں اُٹھاتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ منافعہ تو اسے نظر آ جاتا ہے مگر نقصان نظر نہیں آتا۔ اسے جو کچھ منافع ملتا ہے وہ دراصل نفع و نقصان دونوں سے چھن کر آتا ہے۔ لہٰذا ظاہری صورت تو صرف منافع کی نظر آتی ہے اس لئے یہ ربا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل وہ نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور اس لحاظ سے یہ مضاربت ہی کی ایک شکل ہے۔ اس تجارتی منافعہ اور مضاربت کے منافعے میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ مضاربت میں حصہ رسدی منافعے میں ہوتا ہے جو غیر معین ہے اور کمرشل انٹرسٹ میں نفع معین ہوتا ہے۔ قرض لینے والا اُس میں بھی کماتا ہے اور اس میں بھی۔ قرض دینے والا وہاں بھی منافعے میں شریک ہوتا ہے اور یہاں بھی۔

دونوں کا تشابہ اور تباین اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

کمرشل انٹرسٹ مضاربت بھی ہے اور ربا بھی۔ یا یوں کہئے کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ ایک لحاظ سے یہ مضاربت بھی ہے اور دوسرے لحاظ سے ربا بھی۔ ربا اس لئے ہے کہ اس میں ربا ہی کی طرح منافعے کی رقم معین ہے جو بہر حال قرض لینے والا ادا کرتا ہے۔ اور مضاربت اس لئے ہے کہ جس طرح قرض لینے والا اپنے منافعے کا ایک حصہ قرض دینے والے کو دیتا ہے اسی طرح یہاں بھی اپنے منافعے ہی میں سے ایک معین حصّہ ادا کرتا ہے۔

یا یوں کہئے کہ یہ مضاربت نہیں ہے کیونکہ اس میں حصہ رسدی کے مطابق شرکت نہیں ہوئی بلکہ معین رقم سے ہوتی ہے۔ اور یہ ربا بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں منافعہ لینے والے کا یکطرفہ منافعہ نہیں ہوتا۔

سلبی و ایجابی پہلو اگر ہم کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیں تو اس کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری نہیں کہ یہ سو فیصد مضاربت ہے بلکہ اس کے لئے صرف اسی قدر ثابت ہونا کافی ہے کہ یہ ربا نہیں ہے۔ لین دین میں حلت کے لئے مضاربت ہونا ضروری نہیں بلکہ ربا نہ ہونا ہی عدم حرمت کے لئے کافی ہے۔ یہ عدم حرمت ایک سلبی پہلو ہے ..... لیکن ہم اگر ذرا اور آگے بڑھیں تو ایک ایجابی پہلو بھی اس میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ربا لینے والے اور کمرشل انٹرسٹ لینے والے کے ذہنی رجحان میں اور اس کے نتائج میں بھی بڑا فرق ہے ..... ربا خوار ضرورتمند کی مجبوری سے اپنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ قرض لینے والے کا کیا حال ہوتا ہے۔ بلکہ عموماً وہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ قرض لینے والا قرض ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکے اور سود کی رقم اتنی بڑھ جائے کہ اس کی تمام جائداد کو قرق کرا کے یہ اس پر قبضہ کر لے۔ لیکن تجارت کے لئے جو قرض لیا جاتا ہے اس میں یہ رجحان نہیں ہوتا کیونکہ یہاں قرض لینے والے کا بھی اسی میں فائدہ ہے کہ قرض لینے والا تجارت میں کامیاب ہوتا رہے۔ اور نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ آج دنیا کا سارا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے۔

قابلِ غور مثال اس سلسلے میں چند مثالوں پر غور کرنا بھی ہمیں نفس مسئلہ سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص آٹھ سو روپے کی ایک بھینس خریدتا ہے جو روزانہ دس پندرہ سیر دودھ دیتی ہے۔ یہ اپنی بھینس ایک شخص کو اس شرط پر دیتا ہے کہ تم اس کی خدمت کرو اور اس کے دودھ، دہی، گھی، مکھن سے فائدہ اٹھاؤ اور مجھے چار پانچ سیر دودھ روزانہ دے دیا کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی شرائط پر وہ بھینس کسی کے حوالے کرے اور وہ ان شرائط کو قبول کرے تو کیا یہ سودا کسی فقہ کی رُو سے ناجائز ہوگا؟

دوسری مثال ایک اور رائج الوقت مثال بھی لیجئے۔ ایک شخص کئی عدد رکشا یا تانگہ گھوڑا لوگوں کو اس شرط پر دیتا ہے کہ تم مجھے روزانہ اتنی رقم ادا کر دیا کرو۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سودا حرام ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کے سودے جواز کی حد میں آتے ہیں۔ مالک یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس اس کی خدمت کے لئے یا روزانہ کے حساب کتاب کے لئے وقت نہیں۔ اس لئے وہ دودھ یا رقم کی ایک مقدار پر قانع ہو جاتا ہے۔ اور سودا کرنے والا یہ دیکھتا ہے کہ بھینس یا رکشا خریدنے کے لئے ہمارے پاس سرمایہ نہیں۔ اگر کسی سے ہم یہ بھینس یا رکشا لے لیں تو نفع نقصان کو نکالنے کے بعد بھی ہماری اوسط بچت اتنی ہوگی۔ اس میں سے اگر ہم مالک کو اتنا دے دیں جب بھی ہمیں اتنا کچھ بچ رہے گا۔ غرض اس میں معاملہ کرنے والے دونوں فریقوں کا فائدہ متوقع

ہے اس لئے اس میں عدم جواز کا پہلو تلاش کرنا کچھ درست نہیں۔ اب خوب غور سے دیکھئے کیا کمرشل انٹرسٹ کی بالکل یہی شکل نہیں؟

قابلِ لحاظ اور ضروری باتیں

ہاں اس قسم کے سودے میں بھی عدم جواز کے پہلو نکل سکتے ہیں۔ اور ان سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جب اس قسم کا معاملہ ہو تو:

(الف) شرائط ایسی نہ رکھی جائیں جن کے نتیجے میں یکطرفہ منافعہ ہو یا ایک فریق اتنا زیادہ منافعہ لے کہ دوسرے فریق کے لئے زندہ رہنا دشوار ہو جائے۔

(ب) ناگہانی آفات کے لئے بھی — بشرطیکہ تعمدؓ نہ ثابت ہو — رعائتیں موجود ہوں خواہ خود مالک دے یا کوئی سوسائٹی یا حکومت۔

(ج) مفت خوری کا جذبہ یا امکان کم سے کم کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک سوال کا جواب

یہاں "مفت خوری" کے سلسلے میں بھی یہ سن لینا چاہئے کہ کمرشل انٹرسٹ میں بلاشبہ مفت خوری کا شائبہ موجود ہے۔ محنت کرنے والا تو اپنی محنت کا ثمرہ لیتا ہے مگر سرمایہ دار محض اپنے سرمائے کا منافعہ بغیر کسی محنت کے وصول کر کے مفت خوری کرتا ہے جسے یقیناً اسلام پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہئے۔

اوّلاً یہ کہ کیا یہی صورت کرایہ مکان لینے میں نہیں ہوتی؟ کیا اس سے کہیں بڑھ کر ظالمانہ حد تک مفت خوری جاگیرداری میں موجود نہیں؟ اور کیا مضاربت کی بھی بالکل یہی شکل نہیں جسے سارے فقہا جائز بتاتے ہیں؟

ثانیاً کیا دولت کو جمع رکھنا اور اسے گردش نہ دینا بجائے خود ایک بہت بڑی معصیت نہیں؟ اب دیکھئے سرمائے دار کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو وہ اپنا سرمایہ بند رکھے جس میں نہ اس کا فائدہ ہے اور نہ دوسروں کا۔ یا اسے تجارتی منافعے کی شرط پر کسی کو دیدے جس میں اگرچہ مفت خوری کا شائبہ تو پایا جاتا ہے لیکن دولت گردش میں رہتی ہے اور نفع دونوں فریقوں کا متوقع ہے۔ خود سوچ لیجئے کہ ان دونوں راستوں میں کون سا بہتر ہے؟ اکتنازِ بے نفع یا نفع رساں مفت خوری؟

ایک شبہے کا ازالہ

ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنا سرمایہ وہ خود ہی کیوں نہیں تجارت میں لگاتا؟ لیکن اسے نہ بھولنا چاہئے کہ

(الف) اس میں ایک ہی فریق کا فائدہ ہے اور یہاں یہ زیر بحث بھی نہیں۔

(ب) ہر سرمائے دار اس کی اہلیت یا وقت نہیں رکھتا اور ہر ناتجربہ کار یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا وہ اپنی سلامتی اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ اپنا سرمایہ کسی معتبر تجربہ کار کے حوالے کر کے اس کے نفع میں خود شریک ہو جائے۔

یہ نفع اگرچہ معین ہوتا ہے لیکن اس تعین کو وہ مقروض اپنے تمام نفع نقصان کی اوسط کا اندازہ کرکے قبول کرلیتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ نفع بخش مفت خوری ناروا ہونے کے باوجود اس اکتناز سے بہرحال بہتر ہے جس میں کسی کا نفع نہیں۔

بیع سلم سے مماثلت ایک اور چیز پر بھی غور فرمائیے۔ بیع سلم ——— فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔ یہ ہے کیا چیز؟ اسے بھی سنئے:

ھوان یعطی ذھبًا او فضۃً فی سلعۃ معلومۃ الی امد معلوم بزیادۃ فی السعر الموجود عند السلف۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۲ صفحہ ۳۰۲)

بیع سلم کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو ایک معین مدت تک کے لئے سونا یا چاندی (رقم) کسی ایسے متعین سودے کیلئے دے جس کا نرخ قرض دیتے وقت کے نرخ سے زیادہ ہو۔

ترجمے سے شاید پوری بات واضح نہ ہوسکی ہو۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ زید خالد کو نو۹ روپے قرض دیتا ہے۔ اس وقت گندم کا بھاؤ پندرہ روپے من ہے جس کے لحاظ سے نو روپے کے چھ من ہوتے ہیں۔ لیکن زید اسے اس شرط پر رقم دیتا ہے کہ میں اتنی مدت کے بعد تم سے نو من گندم یعنی دس روپے من کے حساب سے لوں گا۔ یہ معاملہ عموماً کاشتکار وغیرہ کرتے ہیں۔ ان کو یہ قوی توقع ہوتی ہے کہ اس رقم قرض کے عوض اگرچہ تین من مزید گندم دینے سے ہمیں پینتالیس روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن پیداوار اتنی ہوگی کہ اس نقصان کے باوجود ہمیں سو روپے مل جائیں گے۔ اسی طرح سرمائے دار کو یہ نظر آتا ہے کہ اس وقت ہم قرض دیتے ہیں تو اتنے دنوں کے بعد ہمیں پندرہ کی بجائے دس ہی روپے من گندم مل جائے گا اور اس طرح پینتالیس روپے کا فائدہ رہے گا۔ یہ ہے بیع سلم اور یہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ اور نظر بہ ظاہر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ اس میں دونوں کا فائدہ ہے اور اس کی شکل نتیجے کے اعتبار سے تقریباً مضاربت ہی جیسی ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مآل کے اعتبار سے بیع سلم اور کمرشل انٹرسٹ میں کیا فرق ہے؟ دونوں نسیئہ (ادھار) ہیں۔ دونوں میں قرض دینے والا اپنے نفع کی مقدار معین کردیتا ہے۔ دونوں میں طرفین خوشی سے سودا کرتے ہیں۔ دونوں میں قرض لینے والا اپنے نفع نقصان کا اندازہ کرکے یہ دیکھ لیتا ہے کہ کچھ زائد واپس کرکے بھی مجھے بچ رہے گا۔ دونوں میں یک طرفہ نفع کا فقدان ہے اور دونوں میں فریقین کو بیع کی طرح اپنا نفع نظر آتا ہے۔

فرق بہت ہلکا ہے اگر بیع سلم اور کمرشل انٹرسٹ میں کوئی فرق ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ کمرشل انٹرسٹ میں قرض دینے والا راس المال سے زائد رقم وصول کرتا ہے اور بیع سلم میں راس المال کی قیمت کے گندم سے زیادہ رقم کا گندم۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں نفعوں میں لفظی فرق کے سوا اور کیا ہے؟ یہ عدل کی کون سی قسم ہے کہ دس روپے کی بجائے بارہ روپے لو تو ناجائز ہو اور بارہ روپے کا گندم لے لو بالکل جائز ٹھہرے؟ کیا نفع اندوزی کی اسپرٹ دونوں میں یکساں موجود نہیں؟ فقہ کا مطلب ہرگز لفظی ہیر پھیر نہیں۔ نظر ہمیشہ اسپرٹ پر رکھنی چاہیئے۔

آپ ذرا اہلِ علم کے سامنے دو استفتے رکھئے!

دو استفتوں کا مختلف جواب (۱) ایک شخص کسی کو ایک ٹیکسی خرید کر دیتا ہے کہ تم اسے چلاؤ اور اسے جس طرح مناسب سمجھو اچھی طرح استعمال کر کے جتنا چاہو کماؤ اور مجھے ہر روز دس روپے دے دیا کرو۔ یہ سودا جائز ہوگا یا نہیں؟

(۲) ایک شخص کسی کو بیس ہزار روپے دیتا ہے کہ تم اس سے ٹیکسی خرید کر چلاؤ اور مجھے دس روپے روز دے دیا کرو۔ یہ سودا جائز ہے یا نہیں؟

آپ یہ دونوں استفتے الگ الگ اوقات میں اہلِ علم سے دریافت کر کے دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ بیشتر حضرات اوّل الذکر کو جائز اور ثانی الذکر کو ناجائز بتائینگے۔ اس وقت انہی سے دریافت کیجئے کہ ان دونوں سودوں میں فرق پیدا کرنے والی کیا چیز ہے؟

ہمارے نزدیک دونوں ہی بیع ہیں۔ اگر جائز ہیں تو دونوں ہی جائز ہیں اور ناجائز ہیں تو دونوں ہی ناجائز ہیں کیونکہ فرق صرف لفظی ہے۔ معنی کوئی فرق نہیں۔

بزنس کا سائنٹیفک انداز ایک بات اور بات بھی سن لیجئے کہ زمانہ اپنی بہت سی باتوں میں اتنا آگے جا چکا ہے کہ پہلے اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ اب سائنٹیفک اور اٹامک دور ہے۔ اور اس نے زندگی کے بے شمار معاملات کو کچھ ایسا سائنٹیفک سا بنا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی تقریباً دو اور دو چار کی طرح یقینی ہو گیا ہے۔ اب اونچی سطح کی جو بزنس ہوتی ہے وہ اٹکل پچو اور اندھے کی لکڑی نہیں ہے کہ ادھر مال روانہ اور اُدھر فکر دور کرنے کیلئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں کہ خدا جانے ہمارا مال پہنچے گا یا نہیں۔ اور اگر پہنچا تو کامیاسی ہوگی یا نہیں۔ اب تو بزنس کا انداز یہ ہے کہ دس ہزار میل سے تار آگیا یا ٹرنک کال آگئی کہ پچاس لاکھ کا فلاں مال بھیج دو۔ ادھر وہ مال پہنچا بھی نہیں اور ادھر خریداروں نے اپنے نام رجسٹرڈ کرا دئے۔ گویا سودا ہو گیا اور بینک کے توسط سے دام بھی ادا ہو گئے۔ پھر مال کے روانہ ہونے کے بعد یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ مال ضائع ہو جائے گا۔ کیونکہ اوّلاً تو طوفانِ حوادث پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے اور ان کا پہلے سے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرے سارا مال ضائع بھی ہو تو کوئی نقصان نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ انشورڈ ہوتا ہے اور پورا معاوضہ مل جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ ہم صرف واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ انشورنس کے جواز و عدم جواز پر بحث نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں اس پر بھی گفتگو کریں گے)

غرض موجودہ دور کی بزنس اندھے کی لکڑی نہیں جس میں اندیشہ ہو کہ کمرشل انٹرسٹ لینے والا تو اپنی رقم لے جائیگا خواہ قرض کی رقم لینے والا نقصان ہی کیوں نہ اُٹھاتا رہے۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کوئی شخص یا گروپ قرض لے کر کمرشل انٹرسٹ ادا کرتا ہے تو وہ اٹکل پچو تجارت نہیں کرتا بلکہ وہ سائنٹیفک انداز کی تجارت ہوتی ہے اور وہ نفع و نقصان کا نسبتی صحیح اندازہ کرکے اپنے منافع کا ایک حصّہ قرض دینے والے کو ادا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا حصّہ رسدی منافعے میں نہیں لگاتا بلکہ رقم قرض پر پرسنٹیج لگاتا ہے۔

بینک فیل بھی کر جاتے ہیں، بزنس میں نقصان بھی ہوتے ہیں۔ لیکن چند فی صد واقعات پر کسی کلئے کی عمارت نہیں کھڑی کی جا سکتی۔ ریلیں اُلٹتی ہیں، طیارے گرتے ہیں، موٹریں ٹکراتی ہیں لیکن ان باتوں سے یہ کاروبار ختم نہیں کر دئے جاتے۔ فتوے غالب حیثیت پر دیا جاتا ہے نہ کہ شاذ پر۔

ایک قابلِ غور آیت موجودہ کاروبار میں بہت جگہ ظلم اور غربا کشی بھی ہوتی ہوگی اس سے ہمیں انکار نہیں بلکہ ہم ان کو دور کرنا اہم فرائض میں سمجھتے ہیں۔ اس وقت تو ہم اس کی عمومی حیثیت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ جہاں تک "اکل بالباطل" کا تعلق ہے وہ صرف موجودہ بزنس ہی میں نہیں، زندگی کے دوسرے گوشوں میں بھی موجود ہے اور شدید تر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت بہت غور طلب ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم۔ (۴: ۲۹)

ایمان والو آپس میں اپنے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ بجز اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارتی معاملہ ہو۔

ہماری دانست میں یہ الّا استثنائے منقطع کے لئے نہیں بلکہ یہ استثنائے متصل ہے۔ یعنی یہاں اکل بالباطل کی ممانعت .... تجارت ہی کے تمام طریقوں سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت کے جن جن طریقوں میں اکل بالباطل ہے وہ سب حرام ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں اکل بالباطل ہوگا وہاں ایک فریق کی عدم رضا ضرور ہوگی۔ اکل باطل میں کھانے والا تو راضی ہوتا ہے لیکن جسے کھایا جاتا ہے وہ کبھی راضی نہیں ہوتا وہ اسے صرف اپنی مجبوری سے برداشت کرتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی تجارت ہو جس میں دونوں فریق کی رضامندی و خوشدلی ہو تو وہ یقیناً اکل بالباطل نہ ہوگا۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے اسی عینک سے کمرشل انٹرسٹ کو دیکھئے۔ کیا اس میں قرض لینے والا اسی طرح مجبور و مظلوم ہوتا ہے جس طرح صرفی اور حاجتمندانہ ضروریات کے لئے قرض لینے والا ہوتا ہے؟ اور کیا وہ قرض دینے والے کے اُس یکطرفہ نفع سے اسی طرح راضی و خوش ہوتا ہے؟ جو ربا حرام ہے وہ وہی ہے جس میں صرف ایک فریق کا خود غرضانہ نفع اور دوسرے کا نقصان ہے۔ کمرشل انٹرسٹ پر جو تجارت کی جاتی ہے اس میں دونوں فریق کی باہمی رضامندی

خوش دلی ہوتی ہے اور کاروبار کی ترقی سے دونوں کی خوش حالی وابستہ ہوتی ہے اور اس صورتِ حال کو الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم میں داخل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نظر نہیں آتی۔ آگے یہ روایت آئے گی کہ خود حضورؐ نے اور بعض صحابہؓ نے تفاضل کے ساتھ قرض واپس کیا ہے۔ یہ اس لئے روا ہے کہ اس میں خوش دلی موجود ہے۔

ایک قابلِ غور فتویٰ آخر میں ہم مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا ارشاد حسین رامپوری کا ایک فتوائے درج کرتے ہیں۔ ذرا اس پر بھی غور فرمائیے۔ لکھتے ہیں کہ:

اگر خریدار بصورت خرید نقد ایک مال کو سو روپے میں خریدتا ہے اور ادھار کی شکل میں مدت ایک ماہ کے بعد ایک سو تین روپے، دو ماہ کے بعد ایک سو چھ، تین ماہ کے بعد ایک سو نو روپے ادا کرتا ہے تو جائز ہے اور ہر ماہ تین روپے زیادتِ ثمن میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح ایک تھان کپڑا دے کر اسی حیثیت کے دو تھان لینا دست بہ دست ہو یا اُدھار دونوں جائز ہیں کیونکہ....

ہم نے "کیونکہ" لکھ کر آگے لکھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس سے فقہی حیلوں اور فقیہانہ لفظی موشگافیوں کا عجیب نقشہ سامنے آجاتا ہے جس میں لفظ تو دیکھے جاتے ہیں اور روح غائب ہو جاتی ہے۔ بہرحال چونکہ اس "کیونکہ" کے بغیر عبارت پوری نہیں ہو سکتی اس لئے اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

کیونکہ جنسیت کے باوجود کیل ناپ یا وزن سے اس کی خرید فروخت نہیں ہوئی۔ (فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ)[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ اگر کوئی شخص ردی چاندی دے کر اس سے کم وزن کی اعلیٰ چاندی لے لے تو یہ ربا ہے۔ کیونکہ وزن میں کمی بیشی ہو گئی۔ اور اگر ایک تھان دے کر ویسے ہی دو تھان لے لے تو یہ ربا نہیں ــــ خواہ نقد ہو خواہ ادھار ــــ کیونکہ کپڑا نہ تولا جاتا ہے نہ مُد اور صاع سے ناپا جاتا ہے۔ پھر اگر سو روپے کا مال لے کر ہر ماہ تین روپے (سود) دیتا رہے تو وہ بھی ربا نہیں کیونکہ مال اور روپیہ ہم جنس نہیں لیکن اگر سو روپے کا مال لے کر ویسا ہی ایک سو تین روپے کا مال واپس کرے تو حرام اور ربا ہو جائے گا کیونکہ دونوں کی جنس ایک ہی ہے۔ یہ فقہی منطق ہماری سمجھ میں کبھی نہ آسکی۔ بہرحال ہمیں سر دست اس "کیونکہ" پر گفتگو نہیں کرنی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اگر بینک کی وساطت سے ایک لاکھ روپے کا ادھار مال منگوا لیا جائے جیسا کہ آج کل کی تجارت میں رواج ہے تو کچھ ماہانہ رقم جو راس المال سے زیادہ ہے ادا کرنے میں کون سی شرعی قباحت لازم آتی ہے خصوصاً مذکورۂ بالا فتوے کی روشنی میں؟ اور پھر اگر اسی بنک کے توسط سے مال نہ منگوایا جائے بلکہ ایک لاکھ روپیہ ہی نقد لے کر تجارت میں لگا دیا جائے اور اسی شرح سے کچھ ماہانہ رقم (راس المال کے علاوہ) ادا کی جائے تو دونوں صورتوں میں وہ کون سا فرق ہے کہ پہلی شکل تو فتوائے مذکور

---

[1] حالانکہ ناپ میں صرف مُد اور صاع کے پیمانے ہی نہیں بلکہ وغیرہ بھی ناپ ہی میں داخل ہیں۔

کے مطابق جائز ٹھہرے اور دوسری صورت ناجائز قرار پائے۔ اس میں وہ کون سا مخصوص قسم کا ممنوعہ ظلم ہے جو اُس میں نہیں ہے؟

اکتناز انفاق کی ضد ہے اسلام دولت کا اکتناز مطلقاً پسند نہیں کرتا۔ اس کے لئے یہ وعید ہے کہ:

ان الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔

جو لوگ سونا چاندی کو جمع رکھتے ہیں اور راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے انہیں دردناک سزا کی خوشخبری دے دو۔

جمع مالا وعدّدہ۔ جو دولت جمع کر کے اسے گنتا رہتا ہے

یہاں آگے چلنے سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کا مطلب خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ اس کا مطلب خیرات دینا نہیں بلکہ ہر جائز ضرورت پر خرچ کرنا ہے خواہ اپنی ذاتی ضرورت ہو یا اپنے اہل وعیال کی یا عام انسانوں کی۔ پھر ضرورت خواہ مادّی ہو یا روحانی سب ہی اس میں شامل ہیں۔ انفاق ضد ہے اکتناز (Hoarding) کی۔ مکتنز اپنی دولت سے نہ خود فائدہ اُٹھاتا ہے نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ وہ صرف مارِ خزانہ بنا بیٹھا رہتا ہے۔ اور خدا انفاق چاہتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور گردش بھی ایسی ہو کہ کسی ایک طبقے میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔

تاکہ صرف تمہارے دولت مندوں میں گردش نہ کرتی پھرے جس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں

چونکہ اس گردشِ عام میں سب کا بھلا ہے اس لئے خدا انفاق چاہتا ہے اور انفاق ہی کو باقی رکھنے کے لئے اس نے اکتناز کی ساری شکلوں کو ممنوع اور مستحق عذاب قرار دیا ہے۔

انفاق کے لئے آمد اور اس کی شکلیں انفاق جیسی محبوب شے اس وقت تک جاری نہیں رہ سکتی جب تک کسی طرف سے آمد بھی نہ ہو۔ اگر آمد نہ ہو تو انفاق ایک ہی بار یا ایک محدود وقت تک باقی رہ سکتا ہے۔ اس لئے انفاق کے لئے آمد بھی ضروری ہے۔

آمد کی دو ہی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر آمد کی صورت پیدا کی جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر۔ یا کم از کم کسی کو نقصان پہنچائے بغیر ہی کمدن کی شکل اختیار کی جائے۔ پہلی شکل میں انسانیت کا خون ہے اور دوسری صورت میں انسانیت کا بھلا ہے۔ لہٰذا اسلام نے پہلی صورت کی تمام قسموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، استحصال واستغلال (Exploitation) کی وہ ساری

شکلیں جن میں کسی ایک فریق پر ظلم ہو اسلام نے ناجائز قرار دی ہیں۔

ربا کی حقیقت اس ظالمانہ استحصال کی ایک شکل "ربا" بھی ہے۔ حرام صرف ربا نہیں بلکہ استحصال کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب حرام ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی طرح ربا ہی میں داخل ہیں۔

ربا صرف دس دے کر گیارہ لینے کو نہیں کہتے۔ یہ فعل اس وقت ربا ہوتا ہے جب اس کے اندر خوش دلی نہ ہو بلکہ جابرانہ دباؤ ہو، انسانی ہمدردی و مروّت کا جذبہ نہ ہو بلکہ دوسروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جب تک ظلم کا پہلو موجود نہ ہو اس وقت تک محض کمی بیشی کے فرق کو ربا نہیں کہا جائے گا۔ اس کی مثال میں مندرجہ ذیل روایات پر غور کیجئے:

(۱) حضرت علیؓ نے اپنا ایک جمل (اونٹ عُصفیر نامی) بیس بعیر (چار سال سے نو سال تک کے اونٹ) کے عوض فروخت کیا ہے اور وہ بھی ادھار۔ (رواہ مالک عن علی)

(۲) عبداللہ عمر نے خراب دراہم قرض لے کر اچھے دراہم واپس کئے اور فرمایا کہ یہ خوش دلی سے دے رہا ہوں۔

(۳) حضورؐ نے خود عبداللہ بن عباسؓ سے قرض لے کر زیادہ واپس کیا۔ (رواہ ابوداؤد)

(۴) حضورؐ نے فرمایا "خیارکم محاسنکم قضاءً" بہتر طریقے پر قرض ادا کرنے والے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ (رواہ عن ابی ہریرہ)

اگر ربا محض یہ ہوتا کہ لینے اور دینے میں برابر کا معاملہ نہیں ہے تو ان ساری روایات میں حضورؐ کا اور صحابہؓ کا عمل نعوذ باللہ ربا کا کاروبار ہی ٹھہرے گا۔

پھر اس سے آگے دیکھئے بعض اوقات لین دین اگرچہ دیکھنے میں برابر برابر کا معاملہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ کسی خارجی ظالمانہ انداز کی وجہ سے ربا میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثلاً دس سیر معمولی گندم دے کر دس ہی سیر اعلیٰ گندم لینا اگرچہ بظاہر اپنے اندر کمی بیشی کا فرق نہیں رکھتا لیکن اگر اس پر کوئی مجبور کیا جائے تو یہ یقیناً ربا ہی کی ایک شکل ہو گی۔ اور اگر یہاں خوش دلی ہو تو اوپر کی روایات کے مطابق یہ ربا نہ ہو گا۔ کیونکہ کسی شے کو ربا بنانے والی چیز استحصال بالجبر، ظلم، خود غرضانہ نفع اندوزی اور دوسروں کی مجبوری سے بے پروائی وغیرہ ہے نہ کہ محض کمی بیشی کا فرق۔

غرض آمدنی کی وہ ساری شکلیں ممنوع کر دی گئی ہیں جس میں ظلم ہو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچے۔ اور جس طریقے میں اپنی آمدنی دوسروں کو فائدہ پہنچا کر (یا کم از کم دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر) ہو اس کی شکل صرف بیع یعنی تجارت ہے۔

تجارت کے علاوہ بھی آمدنی کی دوسری شکلیں ہیں لیکن وہ بھی دراصل کسی نہ کسی صورت میں تجارت ہی ہوتی ہیں۔ ملازمت اپنی صلاحیتوں کی تجارت ہے۔ زراعت بھی قلّے اور محنت کی تجارت ہے۔ کہنا یہ ہے کہ تجارت ہی ایک

ایسا ذریعہ ہے جو دونوں فریقوں کو نفع پہنچاتا ہے دوسرے ذرائع آمدنی اتنے ہمہ گیر نہیں۔ اسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ:

ان تسعة اعشار رزقکم فی التجارة۔ رزق کے دس سرچشموں میں سے نو تجارت سے متعلق ہیں۔

خلاصہ خلاصہ یہ نکلا کہ اکتناز ضد ہے انفاق کی اور خدا انفاق چاہتا ہے اور اکتناز نہیں چاہتا۔ نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ انفاق بغیر آمد کے جاری نہیں رہ سکتا۔ اور آمد کے دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک بیع جس میں فریقین کا نفع ہے اور دوسرے ربا (تمام قسم کے استحصال) جس میں صرف ایک ہی فریق کا خود غرضانہ نفع ہے اور دوسرے کا نقصان اور ظلم۔ یہ دونوں ربح اور ربا ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔

حرمتِ ربا کی علت ربا کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کی حرمت کی اصل علت خدا نے یوں بیان فرمادی ہے کہ: لا تظلمون ولا تظلمون ٥ (نہ ظالم بنو نہ مظلوم) یعنی ربا ہر وہ کاروبار ہے جس میں کوئی ایک فریق ظالم یا مظلوم ہو جائے۔ جب ایک فریق ظالم ہوگا تو دوسرا خود بخود مظلوم ہو جائے گا۔ ان دو لفظوں میں اقسام ربا کی ساری کائنات سمٹ کر آگئی ہے اور یہی مضمون حدیث میں لا ضرر ولا ضرار کے دو لفظوں میں بیان کیا گیا ہے یعنی نہ نقصان پہنچایا جائے نہ نقصان اُٹھایا جائے۔ پس جہاں دونوں فریقوں کا فائدہ ہو وہ ربح ہے اور جہاں صرف ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو وہ ربا ہے۔ اگر کسی جگہ ربح و ربا کے دونوں پہلو پائے جاتے ہوں تو غالب پہلو کے مطابق ہی حکم لگایا جائے گا۔

فتویٰ صرف لفظ پر نہیں محض بیع یا تجارت کا لفظ آجانے سے ہر بیع حلال نہیں ہو جاتی۔ اگر اس میں استحصال کی صورت موجود ہو تو خواہ اسے تجارت ہی کہا جائے لیکن وہ ناجائز ہوگی مثلاً بیع غرر (ایسی چیز کی تجارت جو اپنے قبضے ہی میں نہ ہو مثلاً اُڑتے ہوئے پرندے کا سودا)، بیع بالقاء الحجر (پتھر پھینک کر سودا کرنا) بیع ملامسہ (چھو کر سودا کرلینا) غرض اٹکل پچو جتنی بیع ہے اور جن میں ایک فریق کے نقصان کا اندیشہ ہے وہ سب ناجائز ہے حالانکہ "بیع" کا لفظ سب میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح بیع بالحصاة، بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ بھی ہیں۔ پس جس طرح "بیع" کا لفظ آجانے سے ہر بیع حلال نہیں ہو جاتی اسی طرح "سود" کا لفظ آجانے سے ہر سود حرام نہیں ہو جاتا۔ اگر سود خواری ہے تو حرام ہے اور سود مندی ہے تو حلال ہے

اسی طرح کوئی کاروبار محض اس لئے حرام نہیں ہوگا کہ اس طریقۂ کاروبار کے ترجمے میں لفظ سود آگیا ہے۔ کسی کاروبار کا شمار ربا میں اسی وقت ہوگا جب ربا کی اسپرٹ اس میں موجود ہو جسے خدا نے لا تظلمون ولا تظلمون اور رسولؐ نے لا ضرر ولا ضرار فرما کر واضح کر دیا ہے۔

یہ دلیل وزنی نہیں اسی لئے کمرشل انٹرسٹ کے جواز کے لئے یہ دلیل[۱] چنداں وزنی نہیں کہ چونکہ عہد نبوت میں اس کا

---

[۱] جس کا جناب یعقوب شاہ صاحب نے ذکر کیا ہے۔

رواج ہی نہ تھا اور دسویں صدی کے پہلے اس کا کوئی وجود نہ تھا اس لئے قرآن کے ربا کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا۔ کمرشل انٹرسٹ کا رواج نزول قرآن کے وقت ہو یا نہ ہو اس سے کچھ بحث نہیں ہونی چاہئے۔ فیصلہ یوں ہوگا کہ ربا کی اسپرٹ اس میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر پائی جاتی ہے تو وہ ربا ہے ورنہ نہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ قرآن میں فحشاء کی چند ہی شکلیں بیان کی گئی ہیں جو اس وقت عرب میں رائج تھیں۔ موجودہ دور میں بعض ایسی اقسامِ فحشا بھی پائی جاتی ہیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اس وقت فحشاء کا اطلاق فلاں فلاں قسم پر ہی ہوتا تھا اس لئے نوایجاد فحشا اس میں داخل نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی خاص شکل بیع نزول قرآن کے وقت نہ پائی جاتی ہو تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اس وقت یہ شکل موجود نہ تھی لہٰذا اس پر ربا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہو تو پھر یہ بھی دعوے کیا جا سکیگا یہ شکل چونکہ اس وقت موجود نہ تھی لہٰذا یہ بیع بھی نہیں ہوگی۔ دراصل آیندہ پیدا ہونے والی تمام صورتوں میں صرف یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں اسپرٹ کس چیز کی پائی جاتی ہے۔ اگر بیع کی اسپرٹ ہو تو بیع ہوگی اور ربا کی روح ہو، تو ربا ہوگا۔ ہمیں کمرشل انٹرسٹ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ اس میں کون سی روح غالب ہے ربح کی یا ربا کی؟

قرض بھی انفاق کی ایک صورت ہے!

انفاق کی ایک شکل قرض بھی ہے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی قرآن کا سب سے بڑا مشن ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ اہلِ ثروت حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لئے اپنے ہاتھ کھلے رکھیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ انہیں یوں ہی دے دیں اور اگر یوں نہ دے سکیں تو بطور قرض دیدیں۔ قرض بھی نہ دے سکیں تو کچھ رہن رکھ کر دے دیں۔ اگر بروقت قرض ادا نہ ہو سکے تو مزید مہلت دیں۔ غرض انسانیت کے ہر ممکن تقاضے کو پورا کریں۔ حتیٰ کہ "دیوالئے" کا قانون بھی احادیث میں موجود ہے جسے "تفلیس" کہتے ہیں یعنی مفلس قرار دینا۔ مسلم اور اصحابِ سنن حضرت ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ:

اصیب رجل فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ثمار ابتاعھا فکثر دینہ فافلس فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تصدقوا علیہ فتصدق الناس فلم یبلغ ذلک وفاء دینہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم لغرمائہ خذوا ما وجدتم لیس لکم الا ذلک۔

عہدِ نبوی میں ایک شخص نے پھل خریدے مگر اس پر کوئی آفت آگئی اور وہ مقروض ہو کر دیوالیہ ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ لوگو اسے صدقہ دو۔ سب نے صدقات پیش کئے لیکن اس کے قرض کے برابر پھر بھی نہ ہو سکا۔ حضورؐ نے اس کے قرضخواہوں سے فرمایا کہ: یہ جو کچھ ہے سو لے لو۔ اس کے سوا تمہارا اور کوئی حق نہیں رہا۔

غرض ہر طرح حاجتمندوں کی امداد پر اُبھارا گیا ہے لیکن .....

انفاق کی بہتر شکل

اس طرح فی سبیل اللہ امداد کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اس طرح کی مسلسل امداد میں ایک بڑا باریک پہلو یہ بھی موجود ہے کہ اس سے مفت خوروں کی تعداد میں اضافہ

ہوتا جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی قومی یا انسانی خدمت نہیں۔ انفاق، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کا یہ مقصد ہی نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایک طبقہ خیرات دینے والا اور دوسرا بھیک لینے والا موجود رہے۔ اسلام کے معاشی نظام کی اسپرٹ یہ ہے کہ معذوروں کے سوا ہر شخص اپنی محنت سے رزقِ حلال کمائے۔ اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کرے اور دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ بیکاروں اور مفت خوروں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ چند کو خود کفیل بنا دیا جائے۔ اگر ایک ہزار آدمیوں کو ہر روز دونوں وقت کھانا کھلایا جائے تو کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ سَو کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی محنت سے خود روزی پیدا کر کے دس دس کی کفالت کرنے لگیں؟

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بظاہر بے کار یا مفت خور نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ اگر ان کی مالی اعانت کی جائے تو وہ کوئی کاروبار کر کے اپنے آپ کو بخوبی سنبھال سکتے ہیں۔ ان کو قرض دینے سے زیادہ بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔

دو طرفہ منافعہ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے فی سبیل اللہ امداد کرنے والے بہت کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ معذوروں کی امداد میں تو عذر نہیں کرتے لیکن اگر انہیں یہ علم ہو کہ ہماری دی ہوئی رقم سے کوئی شخص معقول نفع حاصل کر سکتا ہے تو قدرتاً ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس نفع میں ہم بھی شریک ہوں تاکہ اُس کا بھی فائدہ ہو اور ہمارا بھی۔

یہیں سے تجارتی نفع کی مشارکت کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کی ایک شکل مضاربت ہے اور دوسری کمرشل انٹرسٹ۔ قرض دینے والا بھی دیکھتا ہے کہ اگر خود تجارت کروں تو اس رقم سے اتنا نفع حاصل کیا جا سکتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اگر دوسرا اسی رقم سے تجارت کرے تو اس کے نفع میں مَیں شریک نہ ہوں۔

ایک شبہے کا ازالہ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے جیسا کہ اوپر بھی لکھا گیا ہے کہ قرض دینے والا خود کیوں نہیں تجارت کرتا تاکہ کمرشل انٹرسٹ کا سوال ہی نہ پیدا ہو؟ بلاشبہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی تاجر کو قرض دینے کی بجائے خود ہی تجارت کرے۔ لیکن اس صورت میں اس غریب کا کیا بھلا ہوگا جو تجارتی کاروبار کے لئے قرض لینا چاہتا ہے؟ قرض دینے والا اسے اتنا معذور نہیں پاتا کہ اسے یوں ہی قرض دے دے۔ یا وہ جس چیز کا کاروبار کرنا چاہتا ہے اس میں اسے (قرض دینے والے کو) کوئی تجربہ نہیں۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اسے قرض دے جس سے اسے بھی فائدہ پہنچے اور میں بھی اس میں شریک ہوں۔

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ یہاں یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مضاربت پر کیوں معاملہ نہیں کرتا؟ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نفعے کی تجارت کرتا ہے اور اس کے پاس خاصی رقم بھی موجود ہے۔ ایک دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ میں بس سروس کا تجربہ رکھتا ہوں مگر میرے پاس سرمایہ نہیں۔ اگر تم رقم لگاؤ تو اس میں خاصا منافعہ

ہو سکتا ہے جس میں ہم دونوں شریک ہونگے۔ اب ظاہر ہے کہ غلّے کی تجارت کرنے والا اگر غلّے کی تجارت میں اپنا روپیہ لگائے تو لگا سکتا ہے لیکن اس میں خود اس کا اپنا فائدہ ہے، موٹر سروس والے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں غلّے کے علاوہ بس سروس کا کام بھی شراکت میں کروں لیکن اسے یہ بھی خیال ہوگا کہ میں خود موٹر کے کام سے بالکل نابلد ہوں اور میری ناواقفیت سے یہ ناجائز فائدہ اس طرح اُٹھا سکتا ہے کہ مضاربت میں میرا جو حصّہ آتا ہے اس میں بٹے بازی سے کام لے اور مجھے پورا حصّہ نہ مل سکے۔ نیز نہ تو میں اس ٹکنیکل کام سے واقف ہوں نہ اس کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے لئے میرے پاس اپنے کاموں سے وقت نکل سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ یہ کرتا ہے کہ اس کام کے لئے جتنی رقم دیتا ہے اس کے منافعے میں اپنا تناسب (Ratio) مقرر کرنے کی بجائے ایک قلیل مگر معیّن منافعے پر قناعت کرتا ہے۔ اور رقم لینے والا بھی اپنے تجربے کی بنا پر یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ اتنی معین رقم دینے میں میرا کوئی نقصان نہیں بلکہ پھر بھی فائدہ ہے اور مضاربت سے کم فائدہ نہیں۔ یہی ہے انفرادی کمرشل انٹرسٹ کی صورت جس میں کسی ایک فریق کا یکطرفہ نفع اور دوسرے کا نقصان نہیں۔ ایسے تجارتی معاملے کو صرف تعیینِ رقم کی وجہ سے ربا کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ کسی فریق پر کوئی ظلم نہیں ہوتا اور لا تظلمون ولا تظلمون کی تعمیل ارشاد ہو جاتی ہے۔

بیع اور ربا کا فرق محض لفظی نہیں

ایک بہت غور طلب سوال یہ ہے کہ بیع یعنی تجارت اور ربا میں کیا فرق ہے۔ فرق بھی ایسا کہ ایک تو اعلےٰ درجے کا کسبِ حلال (واحل اللہ البیع) اور دوسرا قطعی حرام (وحرّم الربوا) اور حرام بھی ایسا کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان۔ العیاذ باللہ۔ عقلِ سلیم بتاتی ہے کہ ان دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے لیکن وہ ایسا بدیہی فرق نہیں جو بکری اور شیر میں ہے بلکہ اس فرق میں ذرا گہرائی، باریکی اور نزاکت ہے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے گا تو یہ کہا جائے گا کہ انما البیع مثل الربوا یعنی جس طرح تجارت میں نفع ہوتا ہے اسی طرح سود خواری میں بھی منافعہ ہوتا ہے۔ محض منافعے پر نظر رکھی جائے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں دکھائی دے گا کیونکہ تاجر دس روپے کا مال خرید کر گیارہ میں فروخت کرتا ہے اور سود خوار دس روپے دے کر گیارہ وصول کرتا ہے۔ بلکہ تاجر تو اسی وقت دس کا مال دے کر گیارہ کھرے کر لیتا ہے اور سود خوار ایک ماہ کی مہلت دے کر دس کے گیارہ بناتا ہے۔ دس کے گیارہ بھی کہاں بلکہ اس سے بھی دس گنا کم۔ یعنی سَو دے کر شاید ایک سو ایک لیتا ہے۔ گویا بظاہر منافعہ دونوں ہی میں نظر آتا ہے اس لئے سود خوار بے تکلف دعوے کر بیٹھتا ہے کہ انما البیع مثل الربوا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر اس معمولی سی یکسانی پر نہیں۔ اس کے عواقب پر اور سب سے زیادہ اس رجحان (ATTITUDE) پر ہے جو تاجر اور سود خوار کے درمیان دیوار آہنی کی طرح حائل ہو کر فرق وامتیاز پیدا کرتا ہے۔

ایک مثال سے اسے یوں سمجھئے کہ اگر محض حصولِ لذت کو اساس قرار دے کر دیکھا جائے تو سفاح (زنا) اور نکاح میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ جنسی اختلاط دونوں میں یکساں ہے لیکن جب زن ومرد کی زندگی کے دوسرے متعلقات کے عام

پہلوؤں پر بھی نظر ہو تو صاف ایک حرام اور دوسرا حلال دکھائی دے گا۔

اب آیئے غور کریں، عقل و نقل کی روشنی میں غور کریں کہ وہ کیا کیا نزاکتیں ہیں جو بیع اور ربا کو بالکل متضاد بنا دیتی ہیں؛ ملاحظہ ہو:

(۱) تاجر ایک مال خریدتا ہے جس کے نقل و حمل پر بھی کچھ مزید صرف کرتا ہے وہ اپنا وقت بھی دیتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے اور اپنے سودے کو ایک قلیل منافعے پر فروخت کرتا ہے۔ سود خوار کوئی مال نہیں خریدتا بلکہ روپے ہی کو مال قرار دیتا ہے اور روپیہ ہی اضافے کے ساتھ وصول کرتا ہے۔ تاجر کی طرح حمل و نقل اور محنت نہیں کرتا۔ گویا اس میں منفعت خوری کا جذبہ غالب ہوتا ہے اور وہ اس چیز کو مال بناتا ہے جو خود مال نہیں بلکہ دراصل صرف ذریعۂ حصولِ مال ہے۔

۲۔ تاجر کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسٹمر (گاہک) زیادہ سے زیادہ خوش حال رہیں تاکہ ہماری خوب بکری ہوتی رہے لیکن سود خوار کی نیت یہ ہوتی ہے کہ یہ مقروض کبھی قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہو تاکہ ہماری سود در سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے اور آخر میں وہ ایسا مجبور ہو جائے کہ اس کی بچی کھچی جائداد کو قرق کرا لیا جائے۔

۳۔ تاجر اگر دس کا مال گیارہ میں دیتا ہے تو وہ ایک روپیہ منافعے کا ہوتا ہے جو وہ لے کر معاملے کو ختم کر دیتا ہے لیکن سود خوار سو روپے دینے کے بعد مسلسل عرصۂ دراز تک اپنی رقم کا سود لیتا رہتا ہے یہاں تک کہ سود کی رقم راس المال سے کئی گنا ہو چکنے یا وصول کرنے کے بعد بھی واجب الادا راس المال اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔

۴۔ تاجر عموماً ضروریاتِ زندگی سے متعلق چیزیں لاتا ہے اور تحت الشعور یہی جذبہ ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کی ضروریات پوری ہونگی اور ہمیں ہماری محنت کا صلہ مل جائے گا لیکن سود خوار کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ اس رقمِ قرض سے کسی کی ضرورت پوری ہوتی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اپنے سود سے دلچسپی ہوتی ہے اور بس۔

غرض معاملہ صرف لین دین کا نہیں بلکہ انسانیت کے قیام و بقا کا ہے۔ ایک کاروبار میں ظلم، حیز، استبداد، حرص و آز، جذبۂ نفع اندوزی، خود غرضی، موقع پرستی، بے دردی، انسانیت کشی، استحصال اور استبداد ہے اور دوسرے میں یہ جذبات نہیں۔ دونوں میں فرق و امتیاز پیدا کرنے والی شے صرف انسانی زاویۂ نگاہ ہے ورنہ بظاہر دونوں لین دین مماثل نظر آتے ہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب اس قسم کے انسانیت کش عناصر کسی دوسرے موقعے پر پیدا ہوں گے تو خواہ اس کا نام تجارت اور کاروبار ہی رکھا جائے لیکن درحقیقت وہ بھی ربا ہی کی کوئی نہ کوئی قسم ہوگی۔ اگر ایک تاجر اپنی تجارت میں فریب و کذب سے کام لیتا ہے یا کسی ضرورت مند کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یا احتکار کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ تو وہ دراصل ربا کا کاروبار کر رہا ہے۔ تجارت نہیں کرتا۔ نہ تو دس روپیہ دے کر گیارہ روپیہ وصول کرتا رہا ہے اور دس کا مال گیارہ روپے میں

فروخت کرنا تجارت ہے۔ اس کا فیصلہ جذبۂ دروں، نیت اور مقصد سے ہوتا ہے۔

ربا کے مفہوم میں کتنی وسعت ہے اس کا اندازہ اس حدیثِ نبویؐ سے کیجئے:

الربوا اثنان وسبعون بابا ادناھا مثل اتیان الرجل امہ وان اربی الربا استطالۃ الرجل فی عرض اخیہ۔ (رواہ الطبرانی عن البراء بن عازب)

ربا کی بہتر یعنی بے شمار قسمیں ہیں، اس کا جو کم سے کم درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا اور اس کی بدترین قسم اپنے بھائی کی آبرو پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔

مطبوعاتِ بزمِ اقبال

مجلۂ اقبال۔ ملیحہ ایم۔ ایم شریف۔ بشیر احمد ڈار

سہ ماہی اشاعت۔ دو انگریزی۔ دو اردو شماروں میں۔ قیمت سالانہ دس روپے۔ صرف اُردو یا انگریزی پانچ روپے۔

میٹافزکس آف پرشیا	مصنفہ علامہ اقبال	۵—۰—۰
امج آف دی وسٹ ان اقبال	مصنفہ مظہر الدین صدیقی	۲—۰—۰
اقبال اینڈ والنٹرزم	مصنفہ بشیر احمد ڈار	۶—۰—۰
فکرِ اقبال	مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۱۰—۰—۰
ذکرِ اقبال	مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک	۵—۰—۰
اقبال اور ملا	مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۰—۱۲—۰
مکاتیبِ اقبال	بنام خان محمد نیاز الدین خان مرحوم	۱—۴—۰
تقاریرِ یومِ اقبال	۱۹۵۴ء	۱—۴—۰
علامہ اقبال	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۱—۸—۰

ملنے کا پتہ

سکریٹری بزمِ اقبال و مجلس ترقی ادب۔ نرسنگداس گارڈن لاہور